کے لوک ناچوں کی صورت میں زندہ ہے مگر کچھ یوں زندہ ہے کہ اگر اس کے تحفظ کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا تو یہ فن ہماری تہذیب میں سے قطعی طور پر غائب ہو جائے گا۔ مشکل یہ ہے کہ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح رقص کو بھی بے حد "فحش" حرکت قرار دے ڈالا گیا ہے۔ یہ درست سہی کہ رقص کے بازاری مظاہر نے اس فن لطیف کو محض عیاشی اور جنسی تشنگی بجھانے کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے مگر، کون سا فن لطیف ہے جو نچلی سطح پر اس سلوک کا مستحق قرار نہیں پایا۔ شعر و ادب کو دیکھیے تو وہاں بھی اس سطح پر فن کی صورت بگڑی ہوئی ہے۔ اسی سطح پر مصوری اور موسیقی کے ساتھ بھی بدسلوکی عام ہے۔ جب ہم شاعری، مصوری اور موسیقی کا جائزہ لیتے ہوئے صرف ان کے اعلیٰ معیاروں کو پیش نظر رکھتے ہیں تو نہ جانے رقص کا جائزہ اس کے گھٹیا معیاروں سے لینے کے کیوں عادی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں تو رقص باقاعدہ ایک تہذیبی قدر ہے۔ مغربی پاکستان میں بھی لوک تہذیب کی حد تک رقص موجود ہے مگر اس کے فن لطیف کی سطح تک بلند ہونے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔ وجہ وہی ہے جس کا ابھی ذکر آچکا ہے کہ رقص کو فحاشی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ جب بھی کہیں ثقافتی مظاہروں کا ذکر آتا ہے تو ثقافت کا باقاعدہ مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اس ذہنیت کے فروغ میں کچھ دخل تو ان ثقافتی مظاہروں کے معیاروں کا ہے اور کچھ اس روش کا کہ ہم اسمگلنگ، چوربازاری، ڈاکہ زنی، قتل، اغوا اور چوری کے سے جرائم پر تو خاموش رہتے ہیں مگر ادھر کسی نے پاؤں میں گھنگرو باندھ کر ایک چھنا کا پیدا کیا، ادھر ہمارے عقائد و نظریات کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ یہ کیفیت تہذیب و ثقافت کے سلسلے میں ہمارے سطحی اور بیشتر نمائشی نقطۂ نظر کی غماز ہے۔ رقص تو جسم کی شاعری، اعضا کی موسیقی اور اشاروں کی مصوری ہے اور اس کے اعلیٰ معیاروں کا تعلق ذہنوں کے اس گداز اور دلوں کی اس نرمی سے ہے جو انسانوں کو حسن و تناسب کا عادی بناتی ہے اور اس کی توجہ کو عدل و توازن کی طرف موڑتی ہے۔ میں یہاں رقص کے سلسلے میں عقائد کی بحث میں نہیں پڑوں گا۔ صرف اتنا عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ انسانی کردار کی کسوٹی اس کا عمل ہے۔

تعمیر

اب فن تعمیر کی طرف آیئے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس فن میں کیا کیا کمالات دکھائے ہیں، کیسے کیسے حسین اور بھرپور اضافے کیے ہیں اور ان کی نازک خیالی نے دنیا بھر کے فن تعمیر کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔ فن تعمیر سے مسلمانوں کا لگاؤ ایک لحاظ سے سنگ تراشی کی ممانعت کا ردعمل بھی ہے

مجھے ایک غیر ملکی کے یہ الفاظ کبھی نہیں بھولیں گے جو اس نے لاہور اور ٹھٹھہ کی عمارتیں اور ملتان کے روضے دیکھنے کے بعد ادا کیے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ شکر ہے، مسلمان مجسمہ سازی کی طرف راغب نہ ہوئے ورنہ انھوں نے فن تعمیر پر جو محنت کی ہے، اس کی آدھی محنت بھی اگر وہ مجسمہ سازی پر صرف کرتے تو یونان و اطالیہ کی مجسمہ سازی گرد ہو کر رہ جاتی۔ مگر برصغیر پاکستان و ہند میں مغلوں کے زوال سے بعد سے لے کر قیام پاکستان تک کے عرصے کا جو خلا ہے، اس میں اسلامی فن تعمیر کو بہت نقصان پہنچا۔ انگریزوں کو قدرتی طور پر اپنا ہی فن تعمیر مرغوب تھا چنانچہ انھوں نے یہاں کے مخصوص جغرافیائی حالات کے مطابق بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ہی فن تعمیر کو رواج دیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حال ہی میں پاکستان کے ایک محترم دانش ور کو راولپنڈی کے اجتماع میں پاکستانی کلچر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہنا پڑا کہ یورپی فن تعمیر بھی ہمیں اپنی ایک عہد ساز تاریخ کی طرف سے ورثے میں ملا ہے، اس لیے وہ بھی ہماری ثقافت کا ایک حصہ ہے۔ یہ مغربی فن تعمیر یقیناً آج بھی ہماری تہذیبی ثقافت کا ایک حصہ ہے اگرچہ میرے خیال میں آزادی کے بعد ہمیں اس زبردستی کے فن سے پیچھا چھڑا لینا چاہیے تھا۔ یہ ہماری ثقافت کا حصہ ضرور ہے مگر اسے ہماری ثقافت کا حصہ رہنا نہیں چاہیے اس لیے کہ نہ صرف یہ اجنبی فن تعمیر ہمارے دور محکومی کی یادگار ہے، بلکہ یہ فن تعمیر ہماری انفرادی روایات کے بھی خلاف ہے اور ہمارے خاص جغرافیائی حالات اور آب و ہوا کے تقاضوں سے دور کی بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ گذشتہ بیس برس کے اندر پاکستان میں جو بڑی بڑی عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں وہ سراسر مغربی فن تعمیر کے نمونے ہیں۔ یہی عمارتیں اگر نیو یارک، لندن یا پیرس میں ہوتیں تو وہاں بھی اجنبی معلوم نہ ہوتیں۔ پھر ہماری اپنی جمالیاتی قدروں کی رو سے ان میں کوئی حسن بھی نہیں ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ فن تعمیر کی اتنی عظیم روایات کی حامل قوم نے آزادی کے بعد اپنی کسی ایک روایت کا احترام بھی ضروری نہیں سمجھا۔ یقیناً مغربی فن تعمیر کے مطابق تیار کی ہوئی عمارتوں کی بھی اپنی ایک افادیت ہے مگر یہ افادیت صرف وہیں بامعنی ہے جہاں جگہ کی شدید قلت ہو۔ اگر نیویارک کا رقبہ اتنا محدود نہ ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہاں اسکائی اسکریپروں کی صورت میں رہائش کے لیے مینار تعمیر کیے جائیں، مگر نقالی کے جذبے کا برا ہو کہ اس کے بعد ان مقامات پر بھی ایسی کھڑکیوں والے مینار ابھر آئے جہاں آس پاس ہزاروں ایکڑ کے کھلے رقبے موجود تھے۔ حد یہ ہے کہ قائداعظم کے مزار تک کے لیے ہمیں غیر ممالک کے

ماہرین سے نقشے طلب کرنا پڑے۔ بڑے بڑے ڈیموں اور بیراجوں کے سلسلے میں مغربی ماہرین سے مشوروں کی حد تک تو ہمارا طرزِ عمل قطعی درست ہے کیونکہ سائنس اور انجینیئرنگ کے شعبوں میں ہم پس ماندہ ہیں اور یہ پس ماندگی ہمارے غیر ملکی حاکم کے اس سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کا نتیجہ ہے کہ محکوموں کو ٹکنالوجی کے میدان میں بہر قیمت پیچھے رکھو۔ یہی وجہ ہے ایشیا اور افریقہ کے تمام نو آزاد ممالک اس شعبے میں مغرب کے محتاج ہیں۔ یہ لوگ بقول خود ہمیں "مہذب" بنانے آئے تھے مگر دراصل اپنی اقتصادی، تجارتی اور سیاسی برتری کو محفوظ رکھنا ہر قدم پر ان کے پیشِ نظر رہا اور یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں سے بھی نکلے ان خطوں کی زمین کی اقتصادیات کی بنیادیں تک بھی چھوڑ کر نکلے۔ چنانچہ یہ تو طے ہے کہ اس ضمن میں ہماری محتاجی خاصی مدت کے بعد ختم ہو گی۔ مگر ہمارے فنِ تعمیر کے باشعور ماہرین کو آزادی کے بعد بڑی بڑی عمارتوں کے نقشے تیار کرتے وقت سب سے پہلے یہ غور کرنا چاہیے تھا کہ وہ پاکستانی ہیں اور ان کی ایک منفرد تہذیب ہے اور ان کی چند نمایاں روایات ہیں اور ہم نے آزادی اسی تہذیب اور انہی روایات کے تحفظ اور نکھار کے لیے حاصل کی تھی۔ افسوس کہ ایسا شاذ ہی ہوا اور آج ہمارے فنِ تعمیر اور مغرب کے فنِ تعمیر میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ ان کی عمارتیں ایک ایک سو سے بھی زیادہ منزلوں پر مشتمل ہیں اور ہم ابھی دس پندرہ منزلوں سے اوپر نہیں جا سکے۔ ہمیں تو اتنی سی توفیق بھی نہیں ہوئی کہ ہم ان عمارتوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کو محرابی صورتیں ہی دے دیتے۔ یقیناً ہر ملک کے فنون ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے رہتے ہیں مگر آج تک یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی قوم نے اپنے فن کو مکمل طور پر فراموش کر کے دوسری اقوام کے فن کی حلقہ بگوشی اختیار کر لی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کراچی، لاہور، ڈھاکہ کی دیکھا دیکھی ہمارے چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی "فلیٹ سسٹم" شروع ہو گیا ہے۔ میں نے ایک ایسے ہی قصبے میں دیکھا کہ ایک بابا ایک فلیٹ کے دروازے میں بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا اور مجھے یہ منظر ایسا لگا جیسے کسی نے شلوار پر فیلٹ ہیٹ پہن لیا ہو۔

موسیقی

برصغیر پاکستان و ہند کی موسیقی میں محض مسلمانوں کا بہت بڑا، بہت اہم اور لطیف انسانی حصہ ہے۔ بدقسمتی سے موسیقی کو بھی گھٹیا فن سمجھ لیا گیا اور اس کے ماہرین کو میراثی کے لقب سے یاد کیا گیا۔ اس سب کے باوجود موسیقی مر نہ سکی مگر انسانی زندگی پر اس کے اثرات، جو پھولوں کی پتیوں پر شبنم کے اثرات کا درجہ رکھتے ہیں،

گھٹتے چلے گئے۔ قیامِ پاکستان پر ہمارے حصے میں بعض بے حد منفرد موسیقار آئے مگر جب یہاں کی قدر ناشناسی سے تنگ آ کر استاد بڑے غلام علی خاں کی سی اہم شخصیت نے ہجرت کا فیصلہ کر لیا تو حالات بے حد مخدوش نظر آنے لگے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جب ہمارا جوش و خروش انتہا پر تھا، ہم اپنی مملکت کی نظریاتی اساس کے لیے بیشتر فنونِ لطیفہ کو مضر قرار دینے لگے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے ہم نے اس نکتے پر غور نہ کیا کہ جسم اور روح کے درمیان ایک چیز وجدان نام کی بھی ہوتی ہے اور جس طرح بھوک اور پیاس سے جسم مرجھا جاتا ہے اور کسی عقیدے کی غیر موجودگی میں روح آسیب میں بدل جاتی ہے۔ اسی طرح فنونِ لطیفہ کے اعلیٰ معیاروں کا عدم وجود، وجدان کی تشنگی پر منتج ہوتا ہے اور جب انسانی وجدان تشنہ رہے تو جسم تو شاید فربہی اختیار کر لے مگر روح ایک ایسے سوکھے ٹھنڈ کی مثال ہو جاتی ہے جس پر چڑیاں تک بیٹھنے سے ڈرتی ہیں۔ انسانی زندگی کو ضروریات اور جذبات اور احساسات کے معاملے میں متوازن رکھنے کے لیے وجدان کی شادابی ضروری ہے اور میں تو موسیقی کو وجدان کی مرغوب ترین غذا قرار دیتا ہوں۔ میں علم موسیقی کا ماہر نہیں ہوں مگر اس مثبت طلسم سے باخبر ہوں جو موسیقی کی برکت سے انسانی وجدان پر اثر تا ہے اور خیر و برکت کے کتنے ہی امکانات کے لیے راہیں ہموار کرتا چلا جاتا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ جہاں ہمارا فنِ تعمیر، فنِ مصوری، اور فنِ شاعری مغرب میں پیدا ہونے والی تحریکوں سے مبالغے کی حد تک متاثر ہوتا رہا وہاں موسیقی آگے بڑھنے کی بجائے رجعت کا شکار ہونے لگی۔ کلاسیکی موسیقی کے ماہرین اپنے فن کو زیادہ سے زیادہ ادق بناتے چلے گئے اور انھوں نے اپنے ذہنوں میں یہ طے کر لیا کہ ان کا فن عوام الناس کے لیے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد موسیقی کانفرنسوں اور ریڈیو پر موسیقی کے اسباق اور آرٹ کونسلوں میں موسیقی کی تدریس کے باوجود یہ فن جہاں اگست ۱۹۴۷ میں تھا اگست ۱۹۷۷ میں بھی وہیں پایا گیا۔ یہ درست ہے کہ بعض گروہوں نے کلاسیکی موسیقی سے عوام کو مخاطب کرنے کی بھی کوشش کی مگر وہ بھی اصطلاحی موشگافیوں میں الجھ گئے اور جب انھوں نے دیکھا کہ اگر ان کے فن میں عوام کے لیے "اپیل" پیدا ہو گئی تو ان کی استادی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا تو وہ بھی عوام سے دست کش ہو گئے اور کلاسیکی موسیقی جو پہلے صرف درباروں کی زینت تھی، آج صرف خاص خاص محفلوں کی زینت ہے اور ان محفلوں میں بھی بیشتر سُر کار ایسے ہوتے ہیں جنھیں تال سُر کا دور دراز کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ پھر کلاسیکی موسیقی نے "ہلکی پھلکی" موسیقی (نہ جانے یہ غلط اصطلاح کس نے گھڑی ہے) کے

ساتھ باقاعدہ نفرت کی اور اسے نہایت گھٹیا قسم کی صدابازی کا درجہ دیا۔ ان استادوں نے یہ نہ سوچا کہ اگر ہمارے ہاں موسیقی اب تک زندہ ہے تو اسی ہلکی پھلکی موسیقی کے دم سے زندہ ہے اور اس موسیقی کے سوتے بھی اسی اصل کلاسیکی موسیقی ہی سے پھوٹتے ہیں۔ یہ ہلکی پھلکی موسیقی بیشتر ہماری فلموں کی مرہون منت ہے۔ ریڈیو کی طرف سے ابھی تک کوئی قابل ذکر اقدام نہیں ہوا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ ریڈیو میں آمدنی کے ذرائع محدود اور [illegible] تو یہ عالم ہے کہ ہم اب تک اس کے بنیادی بولوں کو "سورا ننلتو" سے آگے نہیں بڑھا سکے حالانکہ ان بولوں کو اردو میں زیادہ سلیقے اور قرینے سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اکا دکا کوششیں بھی ہوئیں مگر دراصل استادی کیا جو ہنرمندی نہ ہو۔ اسی غیر منطقی تنقید کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں صرف ہلکی پھلکی موسیقی پنپ سکی ہے اور اس میدان میں ہمارے گانے والوں اور گانوں کی دھنیں بنانے والوں نے دلآویز اضافے کیے ہیں۔ بعض اطراف سے دھنوں کو مغربی ــــ زیادہ تر مصری ــــ رنگ دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ چند برس کے لیے مغربی دھنوں کو اپنانے کا جنون بھی پھیلا تھا مگر ایسا کرتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ پاکستانیوں کی ایک منفرد تہذیب ہے جس کا دوسری تہذیبوں سے نظریاتی رشتہ تو یقیناً ہے مگر اپنی تفصیل میں یہ تہذیب بحیثیت مجموعی نہ ہندوستانی تہذیب کا کوئی حصہ ہے اور نہ عرب و عجم کے کسی ملک سے اسے برآمد کیا گیا ہے۔ یہ تہذیب اسی مٹی کی پیداوار ہے جسے پاکستان کہتے ہیں۔ رہا بعض ذہنوں کا یہ شبہ کہ ہماری اور ہندوستانی تہذیبوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے، تو یہ غلط فہمی صرف اس نسل تک قائم رہے گی جو ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو بالغ اور باشعور تھی۔ اس کے بعد یہ شبہ بہرصورت دور ہو گا۔ کیونکہ اس شبہے کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ اگر ہماری تہذیب ایسی ہی ملی جلی تھی تو پھر ایک الگ مملکت کے قیام کی تحریک اتنی مقبول کیوں ہوئی کہ برصغیر کے وہ صوبے بھی جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، اپنے تہذیبی تحفظ کے لیے اکثریتی صوبوں کے ہم نوا ہو گئے۔ ہماری موسیقی کو اگر کسی سے کچھ حاصل کرنا ہے تو لوک گیتوں اور لوک دھنوں سے حاصل کرنا ہے اور اس معاملے میں اتنا خوش گوار تنوع ان کا منتظر ہے کہ یہ ذخیرہ آئندہ برس ہا برس تک ان کا ساتھ دے گا۔ عالم یہ ہے کہ گاؤں گاؤں کے لوک گیت مختلف ہیں اور اگر گیت یکساں ہیں تو ان کی دھنوں میں اختلاف ہے۔ اگر ہلکی پھلکی موسیقی والے اپنے ملک میں بکھرے ہوئے ان خزانوں کو یکجا کر سکیں تو پاکستانی موسیقی زیادہ

بلیغ، زیادہ تازہ اور زیادہ رسیلی ہو جائے گی۔ مشکل یہ ہے کہ ہم سب شہری تہذیب کے قیدی ہیں اور ہمارے شہر مغرب و مشرق کی تہذیبوں کے مغلوب ہیں۔ پاکستانی تہذیب کے خدوخال شہروں سے باہر کھیتوں اور ان سے پارکے مکانوں سے واضح ہونا شروع ہوتے ہیں مگر وہاں جانے کی فرصت کسی کو نہیں۔

مصوری

ہمارے ہاں جو فنِ لطیف مغرب سے فنِ تعمیر کی حد تک متاثر ہوا، وہ صرف فنِ مصوری ہے۔ مغرب کی عظیم فنی روایات سے کسی کو مجالِ انکار نہیں اور یہ بھی طے ہے کہ ہمارے ہاں تصویر سازی کی کوئی ایسی قابلِ فخر روایت موجود نہیں ہے مگر آزادی سے ربع صدی پہلے ہمارے ہاں فنِ مصوری نے جو حیرت انگیز سنبھالا لیا تھا، وہ آزادی کے بعد عدم توجہی کا شکار ہو گیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ جہاں دوسری قومیں آزادی کے فوراً بعد مبالغے کی حد تک اپنی انفرادیت کو اجاگر کرنے بیٹھ جاتی ہیں۔ وہاں ہم نے مبالغے ہی کی حد تک اپنی انفرادیت سے اغماض برتا اور مغرب کی گرفت سے جسمانی رہائی کے بعد ذہنی رہائی کو کچھ ایسا ضروری نہ سمجھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد ہمارے ہاں جس طرزِ مصوری کا سیلاب آیا اس کا کوئی بہت دور کا رشتہ بھی پاکستان یا اس کی مٹی یا اس کی آبادی یا اس کی تاریخ یا اس کی روایت سے نہیں تھا۔ دراصل فنِ مصوری میں بہت ریاضت درکار ہوتی ہے اور ریاضت بہت مشکل کام ہے۔ اسی لیے مجرد مصوری کو اپنا لیا گیا کہ جس کا حقیقت سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس کا امتیاز یہی یہ ہے کہ خارج سے اس کی کوئی مطابقت نہ ہو بلکہ کچھ بھی لکیروں اور رنگوں کی صورت میں کاغذ پر منتقل ہو۔ وہ صرف مصور کی داخلیت سے تعلق رکھتا ہو۔ فن میں داخلیت اور خارجیت کی بحث بہت پرانی ہے اور اب یہ امر طے ہے کہ فن دونوں کے آمیختے سے قوت اور اثر حاصل کرتا ہے۔ جس طرح شعور وجذبہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ محض انسانی فہم و ادراک ان دونوں کی یک جائی کا نام ہے، اسی طرح محض خارجیت یا محض داخلیت بے معنی اصطلاحیں ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ داخلیتِ محض کی یہ مصوری قطعی طور پر بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ فن کو پہیلی بنانے میں بڑی آسانیاں ہیں اور مصوری کے سے فن کو پہیلی بنانا تو اس لیے سہل تر ہے کہ کینوس پر کوئی بھی خط لگا دیجیے اور رنگ کا کوئی سا دھبہ کہیں بھی گرا دیجیے، دیکھنے والے اس میں مفہوم پیدا کرنے لگیں گے اور مفہوم پیدا نہیں کر سکیں گے تو بد ذوق اور جاہل ٹھہریں گے۔ ہمارے مصوروں کو بھی یہ آسانی میسر آئی تو مصوری کے سامان کے ساتھ انھوں نے جی بھر کر بدسلوکیاں کیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے شاعروں، ادیبوں

عالموں اور دانش وروں میں سے ایسے اصحاب بھی انھیں مل گئے جو بدذوقی اور جہالت کے الزامات سے بچنے کے لیے خود کچھ سمجھے بغیر لوگوں کو ان تصویروں کا مفہوم سمجھانے لگے۔ یہ حضرات دراصل فیشن پرستی اور جدت پسندی کی زد میں آگئے اور یوں "فن کا نقاد" نام پایا۔ پھر اگر ہماری تصویروں میں حقیقت کا کچھ گزر ہوا تو یوں کہ آنکھ تو بنائی گئی مگر اسے ناف میں فٹ کر دیا گیا اور کان ٹھوڑی پر لٹکا دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مصوری سراسر حقیقت نگاری ہی کا نام ہے۔ اس کام کے لیے تو کیمرا ایجاد کیا جا چکا ہے۔ اور تجرید ہر فن لطیف میں ایک نہ ایک حد تک یقیناً موجود ہوتی ہے مگر تجرید محض قطعی بے معنی چیز ہے۔ یہ دراصل فن کار کی تن آسانی کا نام ہے اور تن آسان لوگ فن کار نہیں بن سکتے۔
پاکستانی مصوری گذشتہ بیس سال میں اسی تجرید کی زد میں رہی ہے۔ آج بھی ہمارے بعض قومی اداروں میں ان مصوروں کی بے معنی بلکہ لایعنی تصویریں لٹک رہی ہیں جو ہمارے شعور و دانش اور ہمارے جذبۂ احساس کی ترجمانی سے ہٹ کر ہیں۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ یہی فیشن ہے۔ در مغرب میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ مغرب میں ہو رہا ہے اس لیے مشرق میں بھی ہونا چاہیے ورنہ پس ماندگی کا خدشہ ہے۔ ہمارے یہاں اللہ بخش، چغتائی اور زین العابدین کی مثالیں موجود ہیں۔ ہمارے ہاں صادقین موجود ہے۔ ہمارے ہاں دوسرے کئی ایسے نوجوان مصور موجود ہیں جنھیں اپنی تہذیب و تاریخ کا شعور حاصل ہے مگر وہ تجریدی مصوری کے فیشن کی وجہ سے ابھی تک نمایاں نہیں ہو پائے۔ فن ابداع کے بغیر محض ڈھکوسلا ہے اور ہماری جدید مصوری نے ابداع کو ڈھونڈا ہی نہیں پایا۔ ابھی اسے پاکستان کی سرزمین اور یہاں کے لوگوں اور یہاں کی روایتوں سے تعارف ہی حاصل نہیں ہوا۔ گذشتہ بیس برس میں شاید ہی کوئی ایسا مصور سامنے آیا ہو جسے ہم اس کے احساس و تخیل کے حوالے سے خالصتاً پاکستانی کہہ سکیں۔ ہمارے ہاں بعض بڑے بڑے نام یقیناً موجود ہیں مگر انھیں زبردستی بڑا کر دیا گیا ہے اور زبردستی کا بڑا پن قطعی عارضی ہوتا ہے ------ جس طرح بلبلہ عارضی ہوتا ہے۔

شاعری

میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے ہاں فن شاعری ایک ہموار رفتار سے ترقی پذیر ہے۔ (میں یہاں صرف شاعری سے بحث کروں گا اور بخوف طوالت افسانہ، ڈراما اور ناول سے قطع نظر کروں گا) بلاشبہ شاعری بھی مغرب کی بے معنی نقالی کی زد میں ہے۔ تجرید کا سایہ اس پر بھی پڑا ہے۔ بعض شاعروں نے

ابلاغ کی ذمہ داری قبول کرنے سے بھی انکار کیا ہے مگر بحیثیت مجموعی ہماری شاعری آگے بڑھی ہے اور کسی ایک ہیئت میں نہیں بلکہ ہر ہیئت میں آگے بڑھی ہے اور اس ترقی کی کہانی بڑی دلچسپ ہے قیام پاکستان کے بعد ہماری شاعری کا آغاز خاصی پریشان خیالی سے ہوا - وجہ یہ تھی کہ ہمیں آزادی تو مل گئی تھی مگر اس کی چمک دمک تاریخ کے ایک اتنے بڑے حادثے سے آلودہ ہو کر رہ گئی تھی ، جس کی مثال مشکل ہی سے دستیاب ہوگی - آزادی کی جد و جہد کا عنوان یقیناً لہو ہوتا ہے مگر یہ وہ لہو ہے جو الجزائر میں بہا در جو آج کل ویت نام میں بہہ رہا ہے - ہماری ہمہ گیر تحریک آزادی نے تو ہمارے غیر ملکی حاکم کو جلد ہی بوکھلا دیا اور وہ ہمارے متفقہ مطالبے کے سامنے سپر انداز ہو کر چل دیا - یہ ہمارے جذبۂ آزادی اور احساسِ قومیت کی بے مثال فتح تھی - مگر اس تاریخی کامرانی سے پہلے اور بعد میں فرقہ وارانہ سطح پر قتل اور اغوا کے ایسے ایسے شرمناک واقعات پیش آئے کہ ہمارے اور فریق ثانی دونوں کے معیارِ اخلاق و انسانیت کی دھجیاں اڑ گئیں - اس عالم میں شعرا کے سے حساس طبقے کے ذہنوں پر جو اثر پڑا وہ خاصا ناگوار تھا - یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اعداد کے شکار ہونے لگے - آزادی کی چمک دمک کے ساتھ بے گناہوں کے لہو کی سرخی نے انھیں کافی عرصے تک بوکھلائے رکھا - میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک کے دور میں اگر ہمارے شاعروں نے :

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

اور :

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

کی سی باتیں کہیں تو یہ قیام پاکستان کی خدانخواستہ نفی نہیں کرتیں بلکہ یہ شعرا کے اس دیانت دارانہ کرب کا اظہار تھیں کہ آزادی کی تقریب کو ان سانحات و حادثات سے پاک کیوں نہ رکھا گیا - اس صورت حال کا تجزیہ بعد میں ہوا اور ستمبر ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھارت کی چڑھائی نے اس تجزیے کی تکمیل میں مدد دی ، اب شاید ہی کوئی پاکستانی شاعر ایسا ہو جو یہ نہ جانتا ہو کہ برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ جنون تاریخ کے کن عوامل اور غیر ملکی حکمرانوں کے کن مصالح نے پیدا کیا اور انھیں فوری طور پر روکنا کیوں مشکل تھا - بہر حال میری رائے میں پاکستان کے ان ابتدائی برسوں میں جو شاعری ہوئی ، اس میں بھی پاکستان سے محبت کا عنصر موجود ہے - جب اس دور کے شعرا قتل و اغوا کے حادثوں کے خلاف

چیخ رہے تھے تو دراصل ان کے اس احتجاج کا پس منظر یہ تھا کہ وہ اپنے وطن کی آزاد سرزمین کو ایسے واقعات سے آلودہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ یعنی ان کی تمنا یہ تھی کہ آزاد پاکستان شروع ہی سے جنت بن جائے کا نقشہ پیش کرے۔ اس زمانے میں جن عناصر نے اس شاعرانہ احتجاج پر انتشار پسندی اور وطن دشمنی کے سنگین الزامات عائد کیے، وہ دراصل شاعرانہ دیانت کے مفہوم سے بے خبر تھے اور نہیں جانتے تھے کہ اس دور میں جو کچھ کہا گیا، اس کا کہا جانا ناگزیر تھا۔

یہ وہ دور تھا جب شعرا کا ایک طبقہ حیات اور مسائل حیات کے بارے میں ایک لفظ کہنا کفر سمجھتا تھا۔ ادب برائے ادب اور شعر برائے شعر کی لایعنی اور بے سروپا بحث ان دنوں زوروں پر تھی۔ یہ لوگ رجعت کے اس جوش میں ——— شاید ردعمل کے طور پر ——— پیچھے ہٹے تو غالب پر بھی نہ رکے بلکہ میر تقی میر تک ہٹتے چلے گئے اور نہ صرف میر کے خیالات اپنائے بلکہ میر کی زبان تک اختیار کرلی۔ یہ صورت حال اگر طول کھینچتی تو پاکستانی شاعری کو شدید نقصان پہنچ سکتا تھا کیونکہ شعر برائے شعر کے ان علم برداروں میں بعض ایسے شاعر بھی موجود تھے جنھیں قدرت کی طرف سے اعلیٰ درجے کی شاعرانہ صلاحیتیں ودیعت ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان کے اندر یہ احساس بیدار ہونے لگا کہ وہ ایک آزاد مملکت کے ذمہ دار شہری ہیں اور بحیثیت فن کار ان پر بھی ملک، قوم اور معاشرے کی طرف سے چند فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تب وہ پاکستان کی آزادی اور عظمت پر نظمیں اور ترانے لکھنے لگے اور ان کی غزل میں بھی ان کے اپنے دور کے کرب اور کامرانی کو جگہ ملنے لگی۔ یہ جنگِ ستمبر سے صرف چند برس پہلے کی بات ہے کہ پاکستان کے قریب قریب سب اہم شاعروں کی نظم و غزل کے موضوعات میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ ظاہر ہے کہ ان کا لہجہ الگ تھا، وہ حقیقت تک رسائی کے لیے بھی اپنا منفرد راستہ اختیار کرتے تھے مگر جو کچھ وہ کہتے تھے، اس پر بظاہر نہیں تو بباطن سب متفق تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستانی شاعری میں نظم سے زیادہ غزل نے فروغ پایا اور وہ نئی غزل وجود میں آئی جس کے آغاز کا سراغ لگایا جائے تو غالب تک جا پہنچتا ہے، لیکن جسے اقبال نے ذہن بنایا اور جو فیض کے سے شاعروں سے تربیت پاکر ایک نئی غزل کے روپ میں ظاہر ہوئی۔ یہی وہ غزل ہے جس نے غزل پر "نیم وحشی صنف ادب" کے الزام کی ہمیشہ کے لیے تردید کردی ہے، جس میں زندگی ہے، حقائق سے نبرد آزمائی ہے، انسانی ذہن کے نادیدہ گوشوں تک رسائی ہے، غنائیت اور سرخوشی ہے ——— اور پھر یہ سب کچھ اس انداز سے کہا جا رہا ہے کہ غزل، غزل

بن رہتی ہے، کینوس کے پھیلاؤ کی وجہ سے نظم نہیں بن جاتی۔ میری رائے میں اس دور کی غزلوں کا اگر ایک معیاری انتخاب کیا جائے تو اردو شاعری کا شاید ہی کوئی دور اس کا ہم پلّہ قرار پا سکے۔ بظاہر یہ مبالغہ آمیز دعویٰ ہے، اور ان لوگوں کے لیے تو باقاعدہ ایک جھوٹ ہوگا جو نئی غزل کو پڑھے یا سمجھے بغیر نئے شاعروں کی مذمت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، لیکن چند برس بعد کا ادبی مورخ میرے اس دعوے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

نئی غزل کی اس خوش گوار اٹھان کا ایک ردِ عمل یہ ہوا کہ بعض نوجوان اور ذہین شعرا، جو شاید غزل کی نرمی اور نزاکت کو گرفت میں نہیں لا سکے تھے، یورپی اور امریکی تحریک "لایعنیت" کے علم بردار ہو گئے۔ انھوں نے نظم کی ہیئت اور شاعری کی "ڈکشن" اور قومی تہذیبی روایات کے شاعری سے رشتے وغیرہ وغیرہ کی کھلی، اعلان نفی کی اور واشگاف انداز میں کہنے لگے کہ ولی اور میر سے لے کر اب تک کی شاعری (بشمول اقبال کی شاعری) دراصل شاعری نہیں ہے، نثر ہے اور محض پینترے بازی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان شعرا نے بعض ایسی تحریکوں کو اختیار کرنے کی کوشش کی جن کا مغربی معاشرے میں تو شاید کوئی جواز موجود ہو، مگر مشرق میں ——— پاکستان میں ——— یہ تحریکیں ان گورے سیاحوں سے مشابہ تھیں جو آج کل ہمارے بڑے بڑے شہروں کی سڑکوں پر سر اور چہرے کے بال بڑھائے اور نیکریں پہنے گھومتے نظر آتے ہیں۔ ان شعرا نے مشہور زندہ شعرا کے علاوہ اردو کے ہر بڑے شاعر کی مذمت کرنا اپنا فرض قرار دے ڈالا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے سارے ورثے سے کٹ گئے اور خلا میں شاعری کرنے لگے۔ ان کا دور بہت مختصر اور عارضی ثابت ہوا اور ان میں سے بیشتر اپنے نقطۂ نظر سے تائب بھی ہو چکے ہیں۔

مگر اس گروہ نے پاکستان کو بعض ایسے نوجوان شاعر بھی دیے جن کے پاس کہنے کو بھی تھا اور جو سلیقے سے کہہ بھی سکتے تھے۔ یہی وہ نوجوان ہیں جنھوں نے نظم کو اور خاص طور سے نظم معرّیٰ کو ایک مثبت سہارا دیا۔ شاعری کا قاری ان خیالات اور اس اندازِ بیان کا عادی نہیں ہے جو ان ذہین شعرا کو مرغوب ہے۔ اس لیے وہ ان کے ذکر پر ہی ناک بھوں چڑھاتا ہے، حالاں کہ ناک بھوں چڑھانے کا مرحلہ صرف اس وقت پیدا ہونا چاہیے جب کسی شاعر کو بالاستیعاب پڑھ لیا جائے اور قاری اس میں اپنے لیے کوئی "اپیل" نہ پائے۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ان نوجوان شعرا کا مطالعہ بے تعصبی اور پیار سے کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ لوگ پاکستان کی مستقبل کی شاعری کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں اور

ن کی ذہانت اور فن کاری ایک نعمت ہے۔

اگر ہماری شاعری میں کوئی کمی رہی تو وہ صرف یہ تھی کہ ہمارے شعرا کے سامنے پاکستانی قومیت کا کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں تھا۔ وہ شاید بھارت اور اس کے ہم نوا مغربی ممالک کے اس پروپیگنڈے سے متاثر تھے کہ اس ترقی یافتہ دور میں بھلا کوئی مذہب کسی مملکت کے قیام کی بنیاد کیسے بن سکتا ہے۔ ایسا کہنے والے مذہب کو شاید قدیم طرزِ فکر کا کوئی منصوبہ قرار دے لیتے ہیں اور سائنس کے اس دور میں مذہب کے وجود کو سراسر قدامت پسندی سمجھتے ہیں۔ انھیں اس امر کا احساس نہیں ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک قرآن کا مذہب باقاعدہ ایک ضابطۂ حیات کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب دنیا بھر کی قومیں اپنے اپنے ضابطۂ حیات کے مطابق حکومتیں چلا رہی ہیں تو پاکستان کو یہ حق کیسے نہیں پہنچتا کہ وہ بھی اپنے منفرد ضابطۂ حیات کے مطابق اپنے قوانین وضع کرے اور اپنی حکمت عملیاں سوچے۔ اگر ایک ضابطۂ حیات کا نام اشتراکیت ہے اور ایک کا پارلیمانی جمہوریت ہے اور ایک کا سرمایہ داری ہے تو ایک کا نام اسلام بھی ہو سکتا ہے اور کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اشتراکیوں اور سرمایہ داروں نے اشتراکیت اور سرمایہ داری کو مذہب کی سی تقدیس نہیں دے رکھی ہے؟

بہرحال پاکستانی شعرا اس منفی غیر ملکی پروپیگنڈے سے خاصے متاثر رہے مگر ستمبر ۱۹۶۵ء میں جب بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا اور پاکستان کے وجود پر پہلی بار زد پڑنے کا احتمال پیدا ہوا تو پاکستانی شاعروں کے ذہنی افق پر پاکستانی قومیت کی وحدت اور پاکستان کی سالمیت اور پاکستانی تہذیب کی انفرادیت کا آفتاب ابھرا۔ یہ وہ آفتاب ہے جو نو آزاد قوموں کے شعرا کے ذہنوں میں آزادی کے پہلے ہی دن طلوع ہو جاتا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں یہ آفتاب آزادی کے اٹھارہ برس بعد ابھرا مگر بہرحال اب وہ ابھر چکا ہے اور کوئی پاکستانی شاعر ایسا نہیں ہو سکتا جو اس آفتاب کی شعاعوں میں نہا نہ رہا ہو۔ مجھے ان نظموں اور نغموں سے بحث نہیں جو جنگ کے دنوں میں پاکستانی شاعروں نے لکھے۔ ہر غیرت مند قوم کے شاعروں کو ایسا ہی کرنا چاہیے جیسا پاکستانی شاعروں نے کیا، مگر مجھے تو یہ سوچ کر بے اندازہ اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ اب ہمارے شعر میں وہ پاکستانیت داخل ہو گی جس کے دم سے ہماری شاعری دوسرے ممالک کی شاعری سے الگ پہچانی جا سکے گی۔ یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں قومی عصبیت کا دشمن ہوں، امن اور آشتی کا پرستار ہوں، ہر انسان سے، اس کی قومیت کے

امتیاز کے بغیر محبت کرنا میرا ایمان ہے ، رواداری اور فراخ دلی کو میں کسی بھی قوم کے کردار کا عنوان قرار دیتا ہوں ۔ مگر اپنی اس سرزمین کو کسی بھی خطرے یا سازش کی زد میں نہیں دیکھ سکتا جس کی آزادی اور تحفظ میں میرے دس کروڑ ہم وطنوں کی آزادی اور تحفظ پوشیدہ ہے ۔ میں اسی صورت میں اپنی انسان دوستی کا عالمگیر پرچار کر سکتا ہوں جب میرا وطن آزاد ہے ورنہ میری قومی غیرت پر کہیں سے زد نہیں پڑ رہی ہے آج پاکستانی شعرا اسی غیرت مند اور حریت پسند نظریۂ حیات اور نظریۂ فن کے علمبردار ہیں ۔ یہ درست ہے کہ ابھی تک کسی شاعر نے اس پس منظر میں کوئی شاہکار تخلیق نہیں کیا ، مگر دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں کہ کسی تجربہ کو فن میں ڈھلنے کے لیے ۔ اسے اپنی "شخصیت" میں تحلیل کر دینے کا عمل ذرا سا وقت چاہتا ہے اور ٹالسٹائی نے روس پر نپولین کے حملے کے کتنے عرصے بعد "وار اینڈ پیس" لکھا تھا ۔

کاش پاکستانی شاعروں کی طرح اس ملک میں فنون لطیفہ کے دوسرے عناصر بھی پاکستانی تہذیب کی اس صورت پذیری کو اپنی گرفت میں لا سکیں ۔

مسلم ثقافت ہندوستان میں

از مولانا عبدالمجید سالک مرحوم

اس کتاب میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے برعظیم پاک و ہند کو گذشتہ ایک ہزار سالہ کی مدت میں کن برکات سے آشنا کیا ، اور اس قدیم ملک کی تہذیب و ثقافت پر کتنا وسیع اور گہرا اثر ڈالا ۔

قیمت ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ :

سیکریٹری ادارہ ثقافت اسلامیہ ۔ کلب روڈ ، لاہور

جناب میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں

پاکستانی ثقافت

—— ایک اہم سوال

پاکستان نے اپنی ثقافت کے تحفظ کو یقینی بنایا۔ ۱۹۴۷ میں اس ثقافت کا جو حال تھا اور آج ۱۹۷۷ میں اس کا کیا حال ہے؟ یہ ہے وہ اہم سوال جو ہم ایک دوسرے سے اور اپنے آپ سے کر سکتے ہیں۔

پاکستان کی ثقافت کے معنی ہیں ایسی اسلامی ثقافت جو عام انسانی ثقافت کی بہترین شکل ہے۔ اسے ثقافت کہیے، تہذیب کہیے، طرزِ زندگی کہیے، فلسفۂ زندگی کہیے، کچھ کہیے، مدعا یہ ہے کہ وہ طرزِ زندگی جو مسلمان کو انسان اور انسان کو سچا انسان بنا دے۔ ایسی اسلامی ثقافت یا تہذیب کی حفاظت اور نشو و نما کے لیے پاکستان بنا اور بنایا گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اپنے اس امتحان میں کہاں تک پورے اترے ہیں؟

جب سید احمد خاں اور اقبال نے ہمیں حصولِ علوم اور تہذیبِ اخلاق اور اسرارِ خودی اور رموزِ بےخودی کا روحانی سبق دیا اور ہم اپنی صدیوں کی غفلت سے کچھ جاگے تو ہم نے دیکھا کہ وطنی قومیت کا بھوت مہذب قوموں کے سر پہ سوار ہے اور ہمارے ہندو "ہم وطن" ایک ایسی قومیت کے پرستار ہیں جس میں گائے کے تقدس اور ذات پات کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے حکیم الامت نے ہمیں سمجھایا کہ یہ "وطنیت" وہ چیز ہے "قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے جس سے" اس قومیت زدہ دنیا میں اپنوں اور دوسروں کو سمجھانے کے لیے ہمیں اپنی "قومیت" کی تشکیل کرنی پڑی۔

ہم نے دیکھا اور نیک نیتی سے سمجھا اور سمجھایا کہ ہندی قومیت یا دوسری قومیتوں کے مقابل ہماری اسلامی قومیت کم از کم ہمارے لیے زیادہ موزوں و مناسب ہے کیونکہ وہی اصلی اسلامی و انسانی نصب العین کی طرف ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔ اس کے اصول و فروعات کا

مختصراً اظہار قائداعظم نے گاندھی جی کے نام اپنے جوابی خط مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء میں اپنے بچے تلے الفاظ میں یوں کیا کہ :

"ہم ہندوستان کے مسلمان دس کروڑ افراد کی ایک قوم ہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جس کی اپنی ایک امتیازی تہذیب اور اپنا تمدن اور اپنی زبان اور ادب، اپنا آرٹ اور طرز تعمیر، اپنے نام اور اصطلاحات، اپنی اقدار اور اپنے قوانین اور اخلاقی ضابطے، اپنے رسم و رواج اور اپنی جنتری، اپنی تاریخ اور روایات اور اپنی صلاحیتیں اور خواہشات، مختصر یہ کہ زندگی کے متعلق ہمارا اپنا نظریہ اور نصب العین ہے۔ بین الاقوامی قوانین کے ہر معیار سے ہم ایک مستقل قوم ہیں۔"

یہ تھی وہ اسلامی ڈھال جس سے ہم نے ایک زبردست غیر مسلم حملے کا وار کامیابی سے روکا۔ اگر ہمارا عظیم قائد اس مشکل میں ہمارے آڑے نہ آتا تو عجب نہ تھا کہ آریائی تمدن اپنے زور اور ہوشیاری کے بل پر ہمیں اپنے میں جذب کر لینے کی انتہائی اور شاید کامیاب کوشش کرتا لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ اس نے ہمیں موقع دیا کہ ہم جسے اسلامی اور انسانی تہذیب سمجھتے ہیں جس میں ہمارے لیے ہماری اور دنیا کی فلاح وبہبود مضمر ہے ہم پاکستانی قومیت کے ذریعے اس تک پہنچنے کی دشوار لیکن سیدھی راہ کو تلاش کریں۔

کیا ہم نے اس سیدھی راہ کی تلاش کی کوشش کی ہے؟ پچھلے انیس بیس برسوں میں کیا ہم "اھدنا الصراط المستقیم" والے خدا ہمیں سیدھا رستہ دکھا، محض کہتے ہی رہے ہیں یا ہم نے اس صراط مستقیم پر چلنے کی عملاً کچھ سعی بھی کی ہے؟

اس کا جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی ہندوستان میں جس ظلمت نے ہمیں اکثر اطراف سے گھیر رکھا تھا اس میں سے تھوڑا بہت تو ہم باہر نکل آئے ہیں لیکن ابھی ہمارا رستہ ہمارے سامنے پورا روشن و واضح نہیں ہوا۔ یہ روشنی اور وضاحت ہمیں خود اپنے اندر سے پیدا کرنی ہے۔ اللہ کا نور سب دلوں میں مستور ہوتا ہے لیکن اس کا ظہور اسی وقت ہوتا اور ہوسکتا ہے جب انسان خود اس کے لیے اپنے دل میں محبت اور پرخلوص اور پُر زور محبت پیدا کرے۔ انسان اگر خدا کی طرف ایک قدم بڑھائے تو خدا اس کی طرف دس قدم آگے بڑھاتا ہے۔ کچھ ایسا ہے تدبیر و تقدیر کا معاملہ!

واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کی تشکیل کے بعد اور اپنے قائداعظم کی وفات کے بعد ہم نے زیادہ تر